بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یکم اگست ۲۰۰۸

# کلمہ توحید کی تفصیلات

﴿فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (سوتو جان لے کے اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں) سورہ محمد آیت ۱۹

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مذکورہ آیت کا خطاب ہر ایک مخاطب کو ہے اور اگر خاص طور پر حضور اکرم ﷺ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس علم پر جمے رہیں۔

مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان اپنی تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں کہ جب آپ خدائے تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندوں اور سرکشوں دونوں کا حال سن چکے تو آپ اِس بات کا اکمل طریقہ پر یقین رکھیے کہ بجز اللہ تعالیٰ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں علم سے مراد علم کامل اکمل ہے اور اس کے لیے لازم ہے کہ تمام احکام الٰہیہ پر پورا عمل ہو۔ حاصل یہ ہے کہ تمام احکام الٰہیہ پر عمل کرو اور قائم رہو۔

آیت مذکورہ میں رسول خدا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ سمجھ لیجئے کہ اللہ کے سوا اور کوئی قابل عبادت نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ اس بات کا علم تو ہر مؤمن مسلمان کو ہے سید الانبیاء کو کیوں حاصل نہ ہو؟۔ پھر اس کے علم کے حاصل کرنے کا حکم دینا یا تو اس پر ثابت قدم رہنے کے معنی میں ہے اور یا اس کے **مقتضیات** پر عمل کرنا مراد ہے۔ یعنی **لا الہ الا اللہ** کہ جتنے بھی تقاضے اور مطالبات اور مقاصد ہیں ان کو پورا کرنا ہے۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ علم کا کیا مقام ہے؟

تو آپ نے فرمایا کہ مذکورہ آیت میں علم کے بعد عمل کا حکم دیا گیا ہے۔اسی طرح قرآن مجید میں اور مقامات ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اول علم پر اس کے بعد اس کے مقتضیات پر عمل کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

مذکورہ آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ کلمہ توحید پیش کرتے ہوئے ابتداء علم سے کیے ہیں، کیونکہ اگر اس کلمے کا علم حاصل نہیں ہے تو ایمان بھی حاصل نہیں ہے، قرآن مجید میں ۸۵/ سے زیادہ آیات ایسی ہیں جن میں کلمہ طیبہ یا اس کے مضمون کو بیان کیا گیا ہے، احادیث میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آتا ہے۔ایک حدیث میں ہے کہ ایمان کی ۷۰/ سے زیادہ شاخیں ہیں اور سب سے افضل شاخ کلمۂ توحید ہے۔کلمہ ایک زبردست حقیقت ہے، کلمے کا لفظ زبان سے ادا ہوتا ہے اور معرفت کلمہ قلب کی گہرائی میں ہوتی ہے، اور معرفت کلمہ انتہائی قیمتی چیز ہے۔وہ آدمی کی زندگی میں انقلاب لاکر آدمی کو جنت کے قابل بنا دیتی ہے۔ کلمہ ایک عظیم طاقت اور ایک عظیم عقیدہ ہے۔کسی نے کسی عالم سے دریافت کیا کہ کلمے کی وضاحت اور کلمہ کے تقاضے اور مطالبات کیا ہیں؟ جواب دیا گیا کہ تیس پارے ،یعنی پورا قرآن ،یعنی ۶۶۶۶/ آیات پر عمل اِس کلمے کا تقاضہ ہے

## علم کا مَبداء اور علم کا مقصد:

علم کا مبداء اللہ تعالیٰ ہے، اور تعلیم کا اوّلین مقصد حق تعالیٰ کا عرفان ہے، کہ اللہ تعالیٰ کِن کِن صفات اور کِن کِن خوبیوں اور کِن کِن افعال سے مُتّصِف ہے، اور اس کی صفات کا مظہر کائنات ہے۔کائنات گویا قدرت الٰہی کا کارخانہ ہے، الٰہی کارخانے کی عظمت سے اللہ کی عظمت اور اُس کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔قرآن مجید اگر اللہ کا قول ہے، تو کائنات اللہ کے افعال کا مظہر ہے۔جب انسان کو عرفان الٰہی حاصل ہو جاتا ہے،

تو اس سے اللہ کی عظمت و جلال سے دل بھر جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ سے محبت اور خشیت دل میں آجانا ایک لازمی بات ہے۔

علم کا مقصد قرآن کی رو سے یہ جاننا ہے کہ کون کون سے اعمال، اقوال اور احوال اور اعتقادات ہیں جو حق تعالیٰ کو محبوب ہیں، اور کون کون سی باتیں ناپسند ہیں۔ ایمان، توحید، صدق کو اختیار کرنا اور فُسق، غفلت، جہالت اور محویت الی الخَلق سے پرہیز کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہی کو مبداءِ علم قرار دے کر، "علم ہدایت" اور علم اضلال کو سمجھنا ضروری ہے سارے علم کی جڑ، اللہ کا خوف ہے اور یہ انسان میں اسمائے حسنیٰ وصفات وافعال الٰہیہ کو جاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس سے قلب خاشع، نفس قانع، اور دعاء مسموع حاصل ہوتی ہے۔

**لفظ اللہ کی تشریح:**

عربی زبان میں کلمۂ اِلہ کا مادہ تین حرفی ہے۔ (الف۔لام۔ہ) اور یہہ مندرجہ ذیل معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) بندگی کرنا۔ (۲) عبادت کرنا۔ (۳) پناہ لینا۔ (۴) سکون نصیب ہونا۔ (۵) محنت سے اور شوق سے رجوع ہونا۔ (۶) پردہ میں ہونا۔ وغیرہ۔ **اَلِہَ - یَألَہ - اِلٰھاً** مصدر ہے، اِلَہٌ واحد اور آلھۃٌ جمع ہیں۔

علاّمہ طِیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اِلـہٌ. **فِعَالٌ** کے وزن پر ہے، اور مفعول کے معنی میں ہے (جیسے: **کِتَـابٌ**، **مَـکْتُوْبٌ** کے معنی میں ہے، یعنی لکھی ہوئی) یعنی معبودٌ کے معنی میں ہوا۔

علاّمہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِلَـــہٌ سے مراد وہ ذات ہے جس کی طرف دل محبت سے بے قرار ہوتے ہیں، جس کی جلالت اور جس کی شان وعظمت سے دل

مرعوب ہوتے ہیں، اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اسی کا اکرام کرتے ہیں، اسی کی تعظیم کرتے ہیں، اسی کے آگے ذِلّت، خشوع اور خوف سے پیش آتے ہیں، اسی سے اُمیدیں باندھتے ہیں، اوراسی پربھروسہ کرتے ہیں۔ (**لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَۃِ اِلَّا اللّٰہُ**)

علّامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کلمۂ توحید کوصرف لفظی طور پرزبان سے کہہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ ایمان کے لیے لازمی شرط ہے کہ اس کا مطلب سمجھ کر دل سے اس کی گواہی دے اور دل کے اندر اس کا یقین پیدا ہو۔

پروفیسر سلیم چشتی کہتے ہیں کہ: اللہ واجب الوجود ہے-یعنی موجود ہے-اس لیے قرآن نے اللہ کو حق اور ماسِوٰی اللہ کو باطل قرار دیا ہے۔ گویا واجب کی حقیقت موجود ہے اور ممکن الوجود کی حقیقت عدم ہے۔ جب واجب اس کو وجود دیتا ہے تو اس کا وجود محض عارضی، ظلّی یا مجازی اعتباری یا وہمی ہوتا ہے۔ ارباب تصوف اسی صداقت کو جو "**لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ**" میں بیان ہوئی ہے "**لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ**" کہتے ہیں-

**اِلٰــہٌ** کے معنی میں سے ایک معنی معبود کے ہیں اور یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔

(**عَبَدَ. یَعْبُدُ.** عبادت کرنا، **عِبَادَۃً = عُبُوْدَۃٌ = عُبُوْدِیَّۃً** یہ مصادر ہیں۔ **عَابِدٌ** اسمِ فاعل واحد۔ **عُبَّادٌ** جمع۔ **مَعْبُوْدٌ** اسم مفعول واحد مذکر۔ **عِبَادَۃً** اسم مصدر ہے۔)

**عَبْدٌ** اس غلام کو کہتے ہیں جس کو آزادی حاصل نہ ہو۔ **عَبْدٌ** کے دوسرے معنی اللہ کے بندے کے ہیں۔

### لفظ اللہ کیسے بنا؟

سامی زبانوں (عبرانی، عربی، حسیری، قبطی، نبطی، حبشی وغیرہ) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف اور اصوات (آوازوں) کی ایک خاص ترکیب ہے، جو معبودیت

کے معنی میں مستعمل رہی ہے اور تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔اور یہ ہے
ا. ل. ہ اور یہ مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے۔کلدانی اور سریانی کا" الاھیــا" عبرانی کا
اَلُــوہُ اور عربی کا اِلٰـــہ اسی سے ہے،اور بلاشبہ یہی الٰہ ہے، جو حرف تعریف۔ال۔کے
اضافے سے اللہ ہوگیا۔(اَلْ + اِلَاہ) اور حرف تعریف نے اس کو صرف خالق کائنات کے
لیے مخصوص کر دیا ہے۔اور اس کے معنی حیرت اور عاجزی کے ہیں۔اس طرح اللہ کے معنی
حیرت اور عاجزی کے ہوئے۔یعنی عقل حیران ہے اور عاجز ہے اللہ کی ذات کو سمجھنے سے۔

پس خالق کائنات کے لیے یہ لفظ الٰہ اسم اس لیے قرار پایا کہ اس کے بارے میں
انسان جو کچھ جانتا ہے، اور جان سکتا ہے، وہ عقل کے لیے حیرت اور ادراک کے لیے
عجز، درماندگی، بے بسی، اور بیچارگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔اللہ اسم علم اور اسمائے حسنی اس کی
صفات ہیں۔صفات کی توصیف حسنٰی کے ساتھ اس لیے کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان
افعال کی نسبت کی جاتی ہے اِلٰہ پر "ال" لگانے سے " اَلْاِلَاہ" ہوا، پھر تخفیفاً الف گرا دیا گیا
اور ل کو ل م میں مدغم کیا گیا تو "اللہ" ہو گیا۔

## اسمائے حسنٰی کے بارے میں

اسمائے الٰہی کو قرآن مجید میں اسماء حسنٰی سے بیان کیا گیا ہے، جس کے معنی بہترین
اور خوب ترین ہیں۔اسمائے باری تعالیٰ کو حسنٰی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان ناموں پر جس پہلو سے
غور کیا جائے خواہ علم و دانش کی رو سے، خواہ قلبی احساسات و جذبات کے اعتبار سے، یہ سراپا
عمدگی ہی عمدگی اور حسن ہی حسن نظر آتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے کے بعد اس
کے اسم ذاتی، یعنی "اللہ" کے علاوہ اسے جن ناموں سے بھی پکاریں گے وہ اچھا، محبوب اور
دل کو دولتِ اطمینان سے مالا مال کرنے والا ہوگا۔﴿قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ

أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ﴾سورۃ الاسراء، آیت نمبر ۱۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''اے رسول کہہ دیجیے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جیسے بھی پکارو گے اس کے یہ ہر صورت اچھے ہی نام ہیں۔ سورہ اعراف آیت نمبر ۱۸۰ میں ارشاد ہے کہ: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (اللہ ہی کے سب نام اچھے ہیں، لہٰذا اسے انہی ناموں سے پکارو)۔ اسی طرح سورہ طہٰ آیت نمبر ۸ ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى ﴾ میں بھی ہے۔

انسانی فطرت ایسی ہے کہ کسی چیز کے ذاتی نام کے باوجود اپنے قلبی واردات کے اظہار کے لیے اس کے مختلف نام تجویز کرتی ہے، ایسے ہی ناموں کو ''اسمائے صفاتی'' کہتے ہیں۔ اللہ کے ذاتی اسم مبارک کے علاوہ ایسے نام بھی ہیں جن سے اللہ کے جلال و جمال اور کمال و دوام کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان جب دکھ سکھ میں اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کرتا ہے تو اپنی حالت و کیفیت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ایسا نام زبان پر لاتا ہے جو اس کی دلی کیفیت کے بالکل مناسب ہوتا ہے، ایک تنگ دست انسان ''الرَّزَّاق'' کو زبان پر لائے گا اور ایک بیمار ''شافی الامراض'' کہے گا۔ قرآن مجید میں جتنے بھی اسمائے الٰہی وارد ہوئے ہیں سب کے سب تَوقِیفی ہیں، یعنی کسی انسان کی تجویز کردہ نہیں، بلکہ خود اللہ عزوجل نے ارشاد فرمائے ہیں۔ اسمائے حسنیٰ کی تعداد عام خیال کے مطابق ۹۹ر ہیں، بلکہ خود مختلف روایات میں ناموں کی مختلف تعداد بیان کی گئی ہے۔

حدیث: إِنَّ لِلَّهِ تِسْعَةً وتِسْعِينَ اسْمًا مِئَةً إِلَّا واحِدًا، مَن أَحْصَاهَا دَخَلَ الجَنَّةَ أخرجه البخاري (2736) اللہ کے ۹۹ر نام ہیں، جس نے ان کا احصاء کیا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ اس احصاء سے مراد، احصاء شعوری ہے، نہ کہ احصاء لسانی، یعنی اسمائے حسنیٰ کی معرفت

ہے۔اللہ تعالیٰ کے یہ نام دراصل اللہ تعالیٰ کی صفات کے مختلف پہلو ہیں، آدمی خدا پر اور اُس کی تخلیقات پر غور کرتا ہے، تو خدا کی خدائی کے، قادر کی قدرت کے، مختلف پہلو اس کے سامنے آتے ہیں۔انہی پہلوؤں کا شعوری ادراک ہونا، ان کا احصاء کرنا ہے۔اور جو لوگ اس اعتبار سے خدا کی معرفت حاصل کریں، وہ بلا شبہ جنت میں جائیں گے، کیونکہ جنت دراصل معرفت خداوندی کی قیمت ہے۔اسمائے حسنیٰ کے ذریعے آدمی اِس قابل ہوتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں خدا کا تصور اپنے ذہن میں لائے اور وہ حقیقی طور پر خدا سے مربوط ہو سکے۔

اسمائے حسنیٰ کے ذریعے انسان کو خدا کا تصَوّراتی ماڈل یعنی (ConceptualModel) مل جاتا ہے اور بلا شبہ خدا کا تصَوّراتی ماڈل ہی صحیح ماڈل ہے۔اسمائے حسنیٰ کے ذریعے خدا سے جو تعلق قائم ہوتا ہے وہ ایک زندہ اور معلوم تعلق ہوتا ہے، جانا ہوا باشعور نمونہ ہوتا ہے، اس طرح اسمائے حسنیٰ' انسان کے لیے خدا کا مستند (Authentic) تعارف ہے۔اسمائے حسنیٰ کے ذریعے انسان خدا کی صفاتی شخصیت کا یقینی طور پر تصور اپنے ذہن میں لاسکتا ہے۔

جب اقبال کہتے ہیں کہ اسلام کی روح ''نور خودی'' اور ''نار خودی'' ہے، تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ: اسلام خودی یعنی (مومن کی ذات) میں نور و نار کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔نور سے مراد شان جمالی اور نار سے مراد شان جلالی ہے۔

واضح ہو کہ یہ کائنات، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا عکس ہے اور سارے اسمائے حسنیٰ اسی کے صفات ہیں اور یہ صفات دو قسم پر ہیں۔

(۱) جلالی۔ (۲) جمالی۔

**لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں**

لَا اِلٰهَ اس کی شان جلالی کا مظہر ہے۔

اور

اِلَّا اللّٰهُ اس کی شان جمالی کا مظہر ہے۔

کائنات پر اس کی صفات ہر دم تجلی فرما رہتی ہیں، اس لیے رنگ جلال و جمال (نار اور نور) ہر شیء کی نمود کی اصل ہے۔

اسمائے حسنٰی خدا کا وہ تصوراتی ماڈل ہے جو کسی انسانی قیاس پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدا کے الہامی علم پر قائم ہے۔ اسمائے حسنٰی کے ذریعے انسان اُس صحیح فریم ورک (Framework) کو پالیتا ہے جس کی روشنی میں وہ خدا کو اپنے لیے پوری طرح قابل فہم بنا سکے۔ اسمائے حسنٰی کا تصور اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ یہودی کے اعتقادیات کا ماٰخذ عہد نامہ قدیم ہے، اس میں اسمائے حسنٰی کی نوعیت کا خدائی تعارف موجود نہیں ہے۔ ایک جگہ خدا کے بارے میں یہ الفاظ آتے ہیں ''میں جو ہوں سو میں ہوں'' تب موسی علیہ السلام نے کہا، خداوند میں بنی اسرائیل سے کیا کہوں جب وہ پوچھے کہ خدا کا نام کیا ہے؟ خدا نے موسیٰ سے کہا، ''میں جو ہوں سو میں ہوں'' (خروج ۳:۱۴،۱۳)

## اللہ اور خدا میں فرق

''اللہ'' کا لفظ واحد مذکر ہے، اس کا مونث نہیں آتا۔ انگریزی میں اللہ کا ترجمہ God سے کیا گیا ہے۔ یہ لفظ اللہ کا حق ادا نہیں کرتا، جیسے کہ اللہ کی جمع اور مونث نہیں ہے، لیکن لفظ God کا جمع Gods ہے، اور مونث Goddess ہے۔ لفظ اللہ کو کسی اور ذات کی طرف استعمال نہیں کیا گیا سوائے ذات ذوالجلال کے، لیکن لفظ God کئی اعتبارات سے مستعمل ہے۔ جیسے

-God-parents, God-mother, God- father

اس لیے محمد علی پکتھال نے قران مجید کے انگریزی ترجمہ میں لفظ ''اللہ'' کا ترجمہ God سے نہیں کیا ہے، بلکہ Allah سے کیا ہے۔

لفظ ''خدا'' فارسی لفظ ہے اور یہ مرکبات کے آخر میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: ناخدا (ملاح)، ناکتخدا (بن بیاہی) خداوند (وند فارسی میں نسبت اور تشبیہ کے طور پر آتا ہے)۔

## لفظ ''اللہ'' کی خاصیت

الفاظ حروف کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اگر کسی لفظ میں سے کسی حرف کو نکال دیے تو وہ لفظ بے معنی یا بقیہ حروف بے معنی ہو جاتے ہیں۔ جیسے طاہر سے ط کو ہٹا دیں تو الف۔ ہ۔ ر، رہ جاتے ہیں، جو بے معنی ہیں۔ لیکن اس کُلّیہ سے لفظ ''اللہ'' مستثنیٰ ہے، اگر لفظ اللہ سے ''ا'' کم کر دیں تو ''للہ'' رہ جاتا ہے، پھر پہلا ''ل'' ہٹا دیں تو ''لہ'' رہ جاتا ہے، جس کا مطلب معبود ہے، اگر ''ا'' ہٹا دیں تو ''لہٗ'' رہ جاتا ہے، جس کا مطلب ہے اللہ کے لیے، اور اگر ''ل'' ہٹا دیں تو ''ہٗ'' رہ جاتا ہے، ہٗ کے معنی تصوف میں ذات باری تعالیٰ ہے۔

نوٹ: لفظ ''اللہ'' قرآن مجید میں ۲۶۹۷ رمرتبہ وارد ہوا ہے۔

## ایمان باللہ کا مطلب کیا ہے

اللہ پر ایمان اصل ہے اور بقیہ سب اس کی شاخیں ہیں یا ذیلی ہیں۔ یعنی رسول پر ایمان، کتابوں پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان، تقدیر پر ایمان، یہ سب بہر حال ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ پھر بھی ایمان باللہ محور ہے۔ اس لیے کہ کتابیں اگر ہیں تو اللہ ہی کی بھیجی ہوئی ہیں۔ اسی طرح رُسَل، ملائکہ، اور قیام قیامت، تقدیر، سب مِنَ اللہ ہیں۔ اگر ایمان باللہ ہٹ گیا تو سارا نظام جدا ہو جاتا ہے۔ ایمان باللہ کا مطلب ہے: (۱) اُلوہیت کا

تصوّر۔(۲) تمام اشیاء سے اس کی نفی۔ (۳)صرف اللہ سے اس کا اثبات۔

(1-لا 2-الہ 3-الّا اللہ)

## کلمہ توحید کی اہمیت

منصبِ نبوت کے اعتبار سے پہلا قدم نبی کا،کلمۂ توحید **لا الہ الا اللہ** کی دعوت ہے ،چنانچہ مکی زندگی کے ۱۳/سال تک ایمان والا قرآن نازل ہوتا رہا۔تقریباً قرآن کا ۳/۲ حصہ یعنی ۸۶/سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں اور ۱/۳ حصہ قرآن یعنی ۲۸/سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، جن میں احکامات ہیں۔حصول ایمان کی خاطر اس کلمہ کا مطلب سمجھنا ضروری ہے۔یہی وہ کلمہ ہے جس سے لوگ سب سے زیادہ انحراف کرتے رہے ہیں اور جس کو سمجھنے میں لا پرواہی برتتے رہے ہیں۔اس لحاظ سے یہ کلمہ سب سے زیادہ مظلوم ہے۔یہی کلمہ اپنے اندر معنی ومفہوم اور مطلب کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔اس کے اہم معنی حسب ذیل ہیں:

## کلمہ توحید کے دو جز ہیں

پہلے جزء میں چار الفاظ ہیں(۱۔لا ۲۔الہ ۳۔الا ۴۔اللہ)اور دوسرے جزء میں تین الفاظ ہیں(۱۔محمد ۲۔رسول ۳۔اللہ)اس طرح کلمے میں سات الفاظ ہیں۔ان کی تشریح پورا قرآن مجید ہے۔ کلمے کے پہلے جزء میں ۱۲/حروف ہیں اور دوسرے جزء میں بھی ۱۲/حروف ہیں۔کلمہ کی کل (یعنی اصل)''لا'' ہے۔ کلمے میں ''لا'' سے نفی اور''الا'' سے اثبات کا مقصد کلمہ کو تاکید والا اور پُر زور بنانا ہے۔

جس قدر زور''**لا**''اور''**الا**''میں ہے،اس قدر تاکید''**مــا**''اور''**الا**''میں نہیں ہے۔اگر کلمہ کو''**لا**'' اور''**الا**''کے بغیر سادہ طریقے سے لایا جاتا،تو''اللّٰـہُ اِلٰہٌ'' کہتے۔اس

صورت میں عقلاً یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ کوئی اور معبود بھی ہو، جیسے: ''**زید عالم**'' اگر کہیں تو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ زید کے سوا اور کوئی دوسرا بھی عالم ہو، مگر جب ''**لا عــالـم الا زید**'' کہے تو کسی دوسرے کے عالم ہونے کی نفی ہوجاتی ہے۔ بس کلمہ کو نفی ''**لا**'' اور اثبات ''**الا**'' کے ساتھ لاکر کسی دوسرے کے ''**الہ**'' ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

## کلمے کے دو جزء بمنزلۂ واحد کے ہیں:

کلمۂ توحید کئی کلموں سے مُنظّم ہونے کی وجہ سے بظاہر کلام ہے، پھر بھی اس کو کلمہ ہی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ، اس کے معنی اور مصداق ایک ہی حقیقت وجود ہے۔ اس لیے بمنزلۂ واحد ہی کہ ہے۔ ''**لا الہ الا اللہُ**'' اور ''**محمد رسول اللہِ**'' کے درمیان واوَ عاطف یا واوَ مع وغیرہ نہیں ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کلمات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جانا چاہیے۔

موَحّدِین اور مشرکین میں فرق یہ ہے کہ عام موَحدین الوہیت کو واحد حقیقی (صرف اللہ) کے لیے مختص کرتے ہیں اور مجازی الہ سے اس کی نفی کرتے ہیں، اس کے برخلاف مشرکین اگرچہ کے وہ الہ واحد حقیقی کے (یعنی اللہ) قائل ہیں، مگر مجازی الہ سے اس کی نفی نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ ترقی سے محروم ہیں۔

## الوہیت اور رسالت:

الوہیت (**لا الــہ الا اللــہ**) کے ۱۲/حروف ہیں، جو بے نقط ہیں۔ اور رسالت کے ۱۲/حروف ہیں جو بے نقط ہیں، یعنی سارے حروف نوری ہیں اور پورا بیان کلمۂ توحید کا نور کا بیان ہے (لاحرف نفی، الہ اسم وصفی نکرہ، الہ حرف استثناء، اللہ اسم ذات مستثنیٰ)

## الوہیت کے چار اعتبارات ہیں:

(۱) ذات۔ (۲) صفات۔ (۳) افعال (۴) آثار

(۱) ذات۔یعنی اللہ ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات سے قائم ہو، موجود ہو، کیونکہ جو قائم ہونے میں اور موجود ہونے میں دوسرے کامحتاج ہو وہ لائق عبادت کیسے ہوگا؟

(۲) صفات۔ضروری ہے کہ وہ صفات کاملہ رکھے اور صفات ذاتیہ رکھے۔یعنی بغیر روح کے زندہ رہنا، بغیر دل ودماغ کے جاننا اور ارادہ کرنا، بغیر اعضاء وجوارح کے قوت فعل رکھنا، بغیر کان کے سننا، بغیر آنکھ کے دیکھنا، بغیر زبان کے کلام کرنا اور بغیر کسی مادہ اور روح کے تخلیق مادہ وروح اور تخلیق عالم کرنا ضروری ہے۔

(۳) افعال۔افعال کا اختیاری ہونا ضروری ہے، یعنی اعضاء وجوارح کے افعال کا جاری کرنا، جیسے: مارنا (موت دینا)، جلانا (حیات دینا)، پیدا کرنا، ہوا چلانا، بارش برسانا، اُگانا، دن-رات کالانا، ضروریات خلق کو پوری کرنا وغیرہ۔

(۴) آثار۔احتیاج عالم کو پورا کرنا، کائنات کو اور مخلوقات کائنات کو ان کی ساری ضروریات کے ساتھ پالنا، اور ہر وقت اور ہر آن بلا کسی ذاتی غرض کے ان سب کی ضروریات کی نگہداشت اور تکمیل کرنا اور تھکن نہ ہونا۔

اگر مذکورہ اعتبارات سے ''الٰہ'' متصف نہ ہو، تو وہ ہرگز لائق پرستش نہیں ہوسکتا اور جو ذات ان اعتبارات سے متصف ہو وہی اللہ ہے۔چونکہ اللہ تعالیٰ میں یہ سب صفات موجود ہیں اس لیے وہی معبود ہے۔

## کلمے میں اعتبارات نفی:

کلمے کا انکار کرنا کفر ہے اور انکار کرنے والا کافر۔

کلمے میں جوڑ لگانا شرک ہے اور ایسا کرنے والا مشرک۔

کلمے سے پلٹنا ارتداد ہے اور پلٹنے والا مرتد۔

کلمے میں شک کرنا نفاق ہے اور شک کرنے والا منافق۔

مذکورہ باتیں موانعات ایمان ہیں ان سب کی سزا دوزخ کا دائمی عذاب ہے۔

## کلمہ توحید میں "لا" کیا ہے:

وجود اور اس کے لوازم صفات جیسے: (افعال)، مالکیت، حاکمیت، قدرت، حکمت وغیرہ کی نسبت خالق کی طرف کی جانی چاہیے۔ اس کی ضد یعنی عدمیت اور اس کے لوازم صفات، جیسے: موت جہل، اضطرار، عجز، فقر، صم، بکم، عمی، اقتضادیات، استعدادات وغیرہ۔ ان سب کی نسبت مخلوق کی طرف کرنا چاہیے۔ یہ نفی ہے۔ یعنی اعتبارات "الہٰ" اصالۃً خلق میں نہیں ہیں، ان اعتبارات کو خلق سے کاٹ کر، اسباب سے کاٹ کر، چیزوں سے کاٹ کر، ان کی نفی کر کے، ان کو حق میں ثابت کرنا "لا" ہے۔

## احکام اعتبار اثباتی:

(۱) کلمہ کو ماننا، تسلیم کرنا، اسلام ہے۔

(۲) کلمہ کو سچ جاننا اور تصدیق کرنا ایمان ہے۔ (ماننے والا مسلم تصدیق کرنے والا مومن اور شہید)

(۳) کلمے کی تحقیق کرنا اور اس کا فہم حاصل کرنا احسان ہے اور محقق کو محسن کہتے ہیں۔

(۴) تصدیق کے بعد، بصیرت کے اعتبار سے اس کو پیش نظر رکھنا تقویٰ ہے اور اہل نظر کو متقی کہتے ہیں۔

(۵) کلمہ کی تحقیق میں گم ہو جانا توحید حقیقی ہے اور اہل توحید کو مُوَحِّد کہتے ہیں۔

حدیث: "**افضل الاعمال العلم باللہ**" اللہ تعالیٰ کا علم رکھنا افضل اعمال میں سے ہے۔

## ولایت خاصّہ کیا ہے؟

یہ کہ سِرِّ مَعیّت کے علم کو افضل ایمان قرار دیا گیا ہے، یعنی بندہ جب یہ جان لے کہ اللہ اس کے ساتھ ہے، وہ جہاں کہیں ہو، تو ایسے علم کو افضل الایمان قرار دیا گیا ہے۔ اور افضل الاعمال بھی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ سِرِّ مَعیّت کی ملحوظیت اور استحضار سے مومن کے درجات بلند ہوتے ہیں۔

## کلمے سے درجات میں بلندی:

جس طرح کلمہ توحید کے مان لینے سے اصحاب مشئمہ سے نکل کر اصحاب میمنہ میں مومن داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح "سر معیت" سے متصف ہونے سے وہ میمنہ سے ترقی کر کے مقربین میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب حقدار اس علم کا استحضار ہوگا، مراتب بلند ہوں گے۔ چنانچہ سورہ واقعہ میں ان تینوں جماعتوں کا ذکر ہے۔

## کلمہ توحید کے اہم معنی:
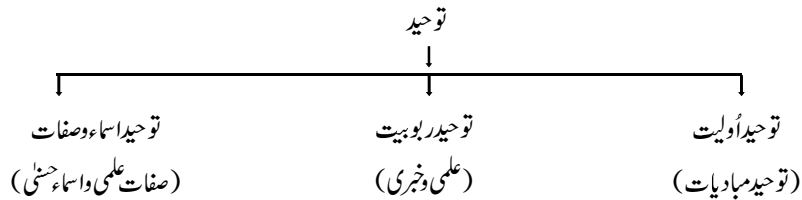
انسان کی زندگی میں سب سے اہم کام اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانا ہے۔

جتنے انبیاء اور رسل (تقریباً ایک لاکھ ۴۰ رہزار) انسانیت کی طرف بھیجے گئے ہیں، ان سب نے توحید کی دعوت دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سب سے زیادہ کوتاہی جس میں انسانیت نے کی ہے وہ توحید ہی ہے۔

توحید کے معنی ایک ٹھہرانا ہے۔ یعنی تعریفاً حق تعالیٰ کی یکتائی بہ اعتبار اس کی ذات وصفات وافعال کے جاننا، اس کی اِکتائی کو سمجھنا، بصیرتاً دیکھنا، پانا اور اَسرارِ توحید میں غرق ہوجانا۔ چنانچہ اسی کے لیے خلق بنائی گئی ہے اور اسی مقصودِ تخلیق کو **"لا الــــــــہ الا الله"** سے پہچانا جاتا ہے۔

## توحید الوہیت کی اہمیت:

باوجود توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات کے ایک کلمہ گو دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ توحید الوہیت پر ایمان نہ لائے۔ توحید ربوبیت پر کفار مکہ بھی ایمان رکھتے تھے، لیکن جو بات رسول خدا اور کفار مکہ کے درمیان جھگڑے کا باعث بنی، وہ توحید الوہیت تھی۔ چنانچہ یہی بات انبیاء سابقین اور ان کی امم کی درمیان محل نزاع تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید الوہیت کا تعلق بندوں کے ان افعال سے ہے، جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ جیسے دعا، نذر، قربانی، امید، خوف، توکل، رغبت، رجوع، فریاد، حاجت برداری۔ یہ سب کے سب افعال عبادات ہیں اور یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہونا چاہیے اور پھر ان سب میں پیروی رسول اکرم ﷺ کی ہونی چاہیے۔ یہ توحید الوہیت ہے کہ محبت ہو تو اللہ سے، خوف ہو تو اللہ سے، امید ہو تو اللہ سے، دعا ہو تو اللہ سے، توکل ہو تو اللہ پر۔ (سورہ فاتحہ، سورہ ہود ۱۲۳ اور ۸۸، سورہ توبہ ۱۲۹، سورہ مریم ۶۵، سورہ فرقان ۵۸، سورہ الحجر ۹۹ وغیرہ۔)

## توحید(لا الٰہ الا اللہ) کے مراتب ستہ:

(۱) لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ

(۲) لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ

(۳) لَا مُتَصَرِّفَ فِی الْعَالَمِ اِلَّا اللّٰہُ

(۴) لَا مَرْجُوَّ اِلَّا اللّٰہُ

(۵) لَا مُخَوِّفَ اِلَّا اللّٰہُ

(۶) اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ. (سورہ یوسف:۴۰)

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ ھُوَ خَیْرُ الْفَاصِلِیْنَ (سورہ انعام :۵۷)

## لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ (نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے):

یہی توحید دین کی ابتدا ہے اور انتہا ہے، دین کا باطن اور دین کا ظاہر یہی ہے، اسی توحید کے لیے تخلیق کائنات کی گئی ہے۔ (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ). اسی کے لیے انبیاء اور رسل بھیجے گئے، کتابیں نازل کی گئیں، اسی توحید کی خاطر لوگ، رشتے دار، دوست، احباب آپس میں بٹ گئے، بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا، ماں سے بیٹی جدا ہوگئی، رشتہ دار غیر ہو گئے، اور غیر رشتے دار سے زیادہ عزیز اسی کلمے کے ماننے کی وجہ سے ہو گئے، اسی کی خاطر بدر و حنین سجے، کچھ کافر ہو گئے، کچھ اہل جنت، تو کچھ اہل دوزخ، کچھ اللہ سے راضی اور کچھ اللہ سے ناراض۔

مشرکین مکہ افعال عبادات کے منکر تھے اور افعال عبادات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے تھے۔ اسی توحید الوہیت کے تقاضوں کی روشنی میں تمام انواع عبادات و تعظیم اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص کر دیے گئے۔

مشرکین مکہ توحید ربوبیت کو مانتے تھے یعنی اللہ کے وجود کو مانتے تھے کہ وہی زمین وآسمان کا مالک ہے، اختیار اسی کو ہے، تصرف اسی کا ہے، وہی خالق ہے، وہی رازق ہے، وہی پالنہار ہے، مگر ان سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو مشرک قرار دیا صرف اس لیے کہ وہ ان سب کے ساتھ درمیانی واسطوں کے بھی قائل تھے، ان واسطوں (وسیلوں) کو اللہ کے قرب اور ان کی خوشی اور ان کی رضا کو اور ان کی شفاعت کو اللہ کی رضا کا سبب سمجھتے تھے، نتیجتاً ان کی خوشنودی کی خاطر دعا، نذر و نیاز، قربانی، محبت اور خوف، امید اور رغبت، بھروسہ اور انابت، توبہ اور تعظیم ان سارے اعمال میں درمیانی واسطوں کو شریک کر لیا کرتے تھے، چنانچہ ان کو ان باتوں سے روکا گیا۔

اسلامی عقیدۂ شفاعت، شریعتِ اسلامی کی رو سے یہ ہے کہ روزِ محشر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شفاعت وہی کر سکے گا جس کو اللہ اجازت دے اور اس شخص کے حق میں کر سکے گا جس کو اللہ اجازت دے۔ اس قاعدے کے تحت نبی کریم ﷺ آخرت میں یقیناً شفاعت کریں گے مگر یہ شفاعت اللہ کے اذن سے ہوگی اور اہل ایمان کے حق میں ہوگی۔

## عبادت کا مفہوم:

عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں۔(وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ . هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ) کلمۂ عبادت میں دو مفہوم شامل ہیں:

(۱) انتہا درجے کی محبت۔ (۲) انتہائی درجے کی اطاعت۔

جب یہ دونوں ایک جگہ ہو جاتے ہیں تو وہ عبادت بن جاتی ہے۔ عبادت کے اصلی معنی ذُلّ یعنی تواضع اور انکساری کے ہیں۔ اس طرح عبادت، محبت اور اطاعت کا نام ہے۔ اگر انسان کسی کے ساتھ انتہائی درجہ کی محبت کرے، لیکن اطاعت نہ کرے تو وہ عبادت

نہیں ہوگی۔اس کے برعکس اگر اطاعت تو کرے اور محبت نہ کرے تو بھی عبادت میں شمار نہ ہوگا (سورہ توبہ:۲۴)

چنانچہ جنس عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ''جنس محبت'' اور ''جنس اطاعت'' میں بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔جتنی محبتیں اور جس قدر اطاعتیں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے ماتحت اور تابع ہوں اور جو محبتیں اور اطاعتیں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اطاعت سے ٹکرا جائیں خواہ وہ آباؤ اجداد کی ہو، خاندان کی ہو، اولاد کی ہو، مال و جائیداد سے ہو، شریک حیات سے ہو، دوست واحباب سے ہو، رشتہ داروں سے ہو، ان سب کو تابع رہنا چاہیے، کیونکہ یہی تقاضائے ایمان ہے (سورہ بقرہ:۱۶۵)

اللہ تعالیٰ کی محبت کے ذیل ہی میں سب سے زیادہ اللہ کے رسول کا حق ہے، چنانچہ اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنا ہی مسلمان کا شیوہ ہے۔(سورہ توبہ:۶۵)

## اعمال عبادت سوائے اللہ کے اور کسی کے لیے جائز نہیں ہیں

(۱) نماز۔رکوع۔سجدہ

(۲) دعا۔اسی طرح شفاعت بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے اس کی اجازت کے بغیر شفاعت ہو سکتی ہے نہ کرائی جا سکتی ہے۔(سورہ الزمر:۴۴-۴۳)

(۳) ذبح و قربانی اللہ کے نام کے سوا کسی کے لیے نہ کی جائے (سورہ انعام:۱۶۳-۱۶۲)

(۴) نذر و نیاز اور اس قسم کی ساری چیزیں، سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لیے جائز نہیں ہیں۔

(۵) طواف۔سوائے بیت اللہ کے اور کسی جگہ کا جائز نہیں ہے۔(سورہ الحج:۲۹)

(۶) توبہ۔سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے سامنے نہیں کی جاسکتی، کیونکہ وہی معاف کرنے والا ہے)(سورہ آل عمران:۱۳۵)

(۷) پناہ صرف اللہ کی حاصل کی جاسکتی ہے، کیونکہ جائے پناہ وہی ہے اور کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

(۸) فریاد(استغاثہ)صرف اللہ ہی سے مدد طلب کی جاسکتی ہے۔(سورہ انفال:۹)

نوٹ: علم کی عظمت، معلوم کی عظمت سے ہے، یعنی معلوم جب عظمت والا ہے تو اس کا علم بھی باعظمت ہے، اسی طرح عالم بھی عظمت والا ہے۔

## لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ (اللہ کے سوا کوئی محبوب نہیں ہے):

لا الہ الا اللہ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ''الہ'' اس معبود کو کہتے ہیں جس کی طرف دل، محبت سے اسکی تعظیم کے لیے جھک جائے۔محبوب حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، محبت کا سر چشمہ اللہ ہے، جذبات وعواطف کا اصل حقدار اللہ ہے۔پھر وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی محبت میں کسی کو شریک کیا جائے۔وہ تو یہی چاہتا ہے کہ اصل محبت ہو تو اسی سے ہو اور بقیہ محبتیں اور چاہتیں اس کے تابع ہوں اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کو اللہ مشرک قرار دیتا ہے(سورہ بقرہ:۱۶۵)

## اللہ سے محبت کرنے والوں کے اوصاف:

اللہ تعالیٰ بندوں سے محبت کرتے ہیں اور بندے اللہ تعالیٰ سے۔بندوں کی محبت اللہ کی محبت کا ادنیٰ عکس ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے مومنین آپس میں انتہائی رحم دل اور متواضع ہوتے ہیں۔

(۲) انکساری اور عاجزی میں ایک دوسرے کے سامنے بچھ جاتے ہیں۔ بیٹا، باپ کے سامنے، اور غلام، آقا کے سامنے۔

(۳) کفار کے حق میں وہ صاحب قہر ہوتے ہیں۔

(۴) وہ اللہ کی راہ میں ہر اعتبار سے جہاد کرتے ہیں۔ جہاد کرتے ہوئے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

جب مومن کا یہ عقیدہ ہو جاتا ہے تو خیر کا جلوہ ہر طرف نظر آنے لگتا ہے۔ اللہ سے محبت کرنے والے وسیلہ ڈھونڈتے ہیں تا کہ اللہ کے قریب ہو جائیں۔ (سورہ اسراء :۵۷) اور وسیلے سے مراد، اتباع رسول ﷺ ہے۔ اور اعمال سے مراد اعمال صالحہ ہیں (سورہ مائدہ:۳۵)

## اللہ سے محبت کا معیار:

اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا اصل ذریعہ اتباع سنت ہے اور اتباع سنت کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت ہے (سورہ عمران:۳۱)

وسیلۂ محبت یعنی اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ۱۰/ کام کرنا ہے (علامہ ابن قیم):

(۱) قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کی جائے کہ اس کے ہر لفظ کے معنی مفہوم اور اس کے تقاضوں پر غور وفکر ہو۔

(۲) فرض نمازوں کے بعد نوافل کثرت سے پڑھی جائیں۔

(۳) زبان سے، دل سے اور عمل کے دوران اور زبان حال سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے کیونکہ کثرت ذکر محبت کا نتیجہ ہے۔

(۴) جب خواہشات اور غلبہ ہوتو اللہ کی محبوب چیز کو اپنی محبوب چیز پر ترجیح دیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر غور کرنا اس کی معرفت کے درپے ہوجانا ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ کے ظاہری اور باطنی انعامات واحسانات کو بار بار ذہن میں لاتے رہنا اوران کا مشاہدہ کرنا ہے۔

(۷) دل کی کیفیت ایسی ہو کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی عاجزی اور انکساری ہو۔

(۸) پچھلی رات انتہائی یکسوئی کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنا، تلاوت کرنا، توبہ واستغفار آخر میں کرنا۔

(۹) علماء اور صالحین کی مجالس میں کثرت سے بیٹھنا اور ان سے فائدہ اٹھانا۔

(۱۰) وہ تمام اسباب وذرائع جو اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہیں ان کو دور کرنا۔

## لَا مُتَصَرِّفَ فِی الْعَالَمِ اِلَّا اللّٰهُ (کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ ہی صاحب تصرُّف ہے)

عالم میں کسی کی طاقت اثر یا رسوخ وکرامت نہیں چلتی۔ ﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (سورہ نساء:۷۸) (کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے) اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ میں تصرف ہوتا، اختیار ہوتا، تو اپنے باپ آزر کو بخش دیتے، حضور اکرم ﷺ اپنے چچا ابوطالب کو بخش دیتے، حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کنعان کو کفر کے عالم میں موت پانے نہ دیتے، حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کافرہ نہ ہوتی، طلب صادق نہ ہونے سے ابولہب ایمان سے محروم رہا، طلب صادق کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ سلمان، صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ منزل تک پہنچ گئے۔

## لَا مَرْجُوَّ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کے سوا کوئی امیدوں کا مرکز نہیں ہے):

جب اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اختیار نہیں ہے، مشیت، چاہت اور تصرف، اختیار اور قدرت سب اسی کو حاصل ہے، نفع اور نقصان سب اسی کے ہاتھ میں ہے، ایسی صورت میں تمام امیدیں صرف اللہ تعالیٰ ہی سے وابستہ رکھنا چاہیے اور صرف اسی پر بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے۔ اللہ کے سوا کوئی بھی امید اور توکل کا حقدار نہیں ہے، وہی کارساز ہے، وہی وکیل ہے۔ (بقرہ:۲۱۸، کہف:۱۰۰، فرقان:۵۸، توبہ:۱۲۹، مزمل:۹، مائدہ:۲۳ وغیرہ)

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے تَوَکُّل کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔ جس دل میں توکل نہیں وہاں ایمان نہیں۔ جس کا ایمان قوی ہوگا، اس کا توکل بھی قوی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں توکل کو اور عبادت کو ایک جگہ، اور کہیں توکل کو اور ہدایت کو ایک جگہ بیان فرمایا ہے۔ پھر کبھی توکل اور تقوے کو، اور کہیں توکل اور اسلام کو، اس طرح اسلام کے تمام اعمال میں توکل کو وہی درجہ حاصل ہے جو انسانی جسم میں ''سر'' کو حاصل ہے۔ ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (اے گناہ گاروں تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو) جو آدمی اصلاح حال سے ناامید ہو جاتا ہے، تو وہ اس کے حصول کی کوششیں نہیں کرتا اور جب وہ جدوجہد سے دستبردار ہو جاتا ہے، تو اس کی زندگی اور موت دونوں یکساں ہو جاتے ہیں۔

یاس (ناامیدی) زندگی کے حق میں زہر قاتل ہے، کیونکہ ناامیدی سے ناتوانی، نامرادی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ انسان کی تمام قوتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ زندگی کے چشمے ہی خشک ہو جاتے ہیں۔ یاس (ناامیدی) اور حُزن (رنج وغم) دونوں کا آپس میں شدید رشتہ ہے، اسی لیے زندگی پر دونوں کا اثر یکساں مرتب ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ناامیدی قاطع حیات ہے، اسی طرح حُزن یعنی رنج وغم زہر قاتل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم ﷺ کی زبان سے ہم کو تعلیم عطا فرمائی ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾

اس کی تشریح یہ ہے کہ: بوقت شب جبل ثور پر ایک غار میں آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کے سلسلے میں قیام فرمایا، جب صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی، اس وقت حضرت ابوبکر نے اس غار کے شگاف میں سے کفار مکہ کو دیکھا جو حضور کی تلاش میں تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ وہ لوگ اس شگاف میں سے اگر جھانک کر دیکھ لیے تو ہجرت ناممکن ہے۔ چنانچہ ابوبکر پر رنج وغم کی کیفیت طاری ہوئی۔ آپ نے جذبہ محبت سے مغلوب ہو کر دبی زبان سے رسول خدا سے اس بات کا اندیشہ ظاہر فرمایا، اس پر رسول خدا ﷺ نے اپنی زبان وحی ترجمان سے یہ غیر فانی جملہ ارشاد فرمایا جو اوپر مذکور ہوا۔ اس جملے میں صدیق کو رسول خدا نے اس حقیقت سے آگاہ فرمایا کہ ''اللہ ہمارے ساتھ ہے اللہ ہمارا محافظ ہے'' اس لیے تم اس بات کا غم نہ کرو کہ ہم کو نقصان پہنچے گا اور اگر کوئی ضرر پہنچتا ہے تو یہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگا اور اس کی مشیت ہی سے پہنچے گا، اس لیے مسلمان کو راضی بہ رضائے الٰہی رہنا چاہیے۔

مسلمان کا غمگین ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کو اس کائنات کا مالک اور منتظم نہیں سمجھتا اور اللہ تعالیٰ اس کائنات کو اور اس میں جو کچھ ہے سب کو پیدا کر کے بے تعلق ہو گیا ہے۔ یہ خیال غلط ہے،

نوح علیہ السلام کی امت سے ۸۰/ آدمی ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ میں بقیہ انسانوں کو اور دیگر مخلوق کو غرق کر دوں گا، تم ایک بڑی کشتی بناؤ اور اس میں ایک ایک جوڑا ہر مخلوق کا رکھ لو۔ تو نوح علیہ السلام نے فرمایا، رب ذوالجلال ایک کشتی میں ساری مخلوق، درند، پرند، چرند، حشرات الارض، انسان وغیرہ، اِدھر شیر، اُدھر گائے، اِدھر بھیڑ، اُدھر بکری، اِدھر بلی، اُدھر چوہا، اِدھر

سانپ، اُدھر نیولا۔ یا رحمٰن اور رحیم یہ سب کشتی میں کس طرح رہیں گے؟ تو جواب ملا کے نوح اس مخلوق میں ایک دوسرے کی عداوت کس نے ڈالی؟ ایک دوسرے کی دشمنی دلوں میں کس نے ڈالی؟ کہ ایک دوسرے پر جھپٹنے کا مزاج اور فطرت کس کی طرف سے ہے؟ تو نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ! یہ سب تیری طرف سے ہے۔ تو جواب ہوا اسی طرح ان میں آپس میں محبت بھی میں ہی ڈالوں گا۔ کشتی ٦ / چھ ماہ تک چلتی رہی۔

آسمان اور زمین میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہی کام کرتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اللہ کی اجازت چاہتی ہے۔ آگ اللہ سے اجازت مانگتی ہے کہ اگر حکم ہو تو جلا دوں ورنہ ٹھنڈی ہو جاؤں، پانی اللہ سے اجازت چاہتا ہے کہ اگر حکم ہو تو ڈبا دوں ورنہ راستہ بنا دوں، ساری کائنات اگر نقصان پہنچانا چاہے تو نہیں پہنچا سکتی اور اگر فائدہ پہنچانا چاہے تو نہیں پہنچا سکتی جب تک اللہ نہ چاہے۔ ساری مخلوق عبادت سے پھر جائے تو اللہ کی عزت میں کمی نہیں ہوتی اور اگر ساری مخلوق عبادت میں غرق ہو جائے تو اللہ کی عزت میں زیادتی نہیں ہوتی۔

مقام تسلیم و رضا اسلام کی حقیقت ہے۔ قرآن مجید اس کے قاری میں یہی ذہنیت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مذکورہ واقعہ سے حضرت ابوبکر صدیق کو اللہ تعالیٰ کی معیت کا علم الیقین تھا ،لیکن ارشاد نبوی کے بعد ان کو حق الیقین حاصل ہو گیا۔ چنانچہ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے مولا علی کو لَا تَخَفْ کی خوشخبری سنائی تو سکون ہو گیا۔

خوف سے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں۔ غیر اللہ سے ڈرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عزم اور ارادے میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے، انسان ہر معاملے میں، ہر فعل میں سوچنے لگتا ہے کہ اگر ایسا اقدام کروں تو ایسا ہو گا اور اگر نہ کروں تو ویسا ہو گا۔ غرض یہ کہ وہ ممکنات اندیش ہو کر عمل صالح سے معذور ہو جاتا ہے۔ نہ سچی بات منھ سے نکلتی ہے اور نہ رسول کے

فرمودہ پر عمل کر سکتا ہے۔خوف کی وجہ سے کلمۂ حق زبان پر جاری نہیں ہوتا اور ہاتھ میں رعشہ پڑ جاتا ہے۔اگر انسان نفسیاتی اعتبار سے اپنی شخصیت کا مطالعہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس کے اندر جس قدر اخلاقی عیوب ہیں،سب کے سب کی بنیاد خوف ہے۔مثلاً خوشامد، مکاری، عیاری،کینہ،جھوٹ،فریب،ضمیر فروشی،خود فریبی، یہ سب خوف ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

جب انسان کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی مجھے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی،تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوسکتا۔ڈرتا وہی ہے جو دوسروں کو اپنے سے برتر سمجھتا ہے،یا اس میں نقصان رسانی کی طاقت محسوس کرتا ہے۔جب مسلمانوں کو توحید کا علم صحیح حاصل ہو جاتا ہے تو رفتہ رفتہ غور وفکر اور مجاہدہ سے کائنات کی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے، جو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے حقیقت صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے۔ وہی خالق، وہی رازق، وہی مالک،وہی حاکم،وہی آمر ہے،وہی موثر فی الوجود ہے اور وہی دراصل موجود ہے۔

اس طرح خوف ایک خونخوار جذبہ ہے،جس کا تسلط انسان کے اوپر ہے۔ وہ زندگی میں لرزاں وترساں رہتا ہے۔،خائف اور ہراساں رہتا ہے،کسی کو بیماری کا خوف ہے،کسی کو دنیا میں ناکامی کا خوف،کوئی مصائب سے بے چین و پریشان،کسی کو خوف کہ اس کی دولت نہ لٹ جائے،کسی کو فقر وفاقہ میں مبتلا ہو جانے کا خوف،کسی کو ضعف اور ذلت کا خوف، کسی کو ملازمت کا خطرہ،کوئی ذمہ داریوں سے گھبرایا ہوا،کسی کا دل بیٹھا جا رہا ہے،کوئی بلند مقام سے گر رہا ہے،کوئی ہم جنسوں سے اور ہم نشینوں سے بات کرنے سے گھبرا رہا ہے، کسی کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے،کسی کو کسی معاملے کے سلسلے میں خوف کی لہریں دل میں برابر اٹھ رہی ہیں،اور کوئی بزدلی کی موت مر رہا ہے۔غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص

اس کا شکار ہے، کون ہے جس کو فکر نہیں؟ علماء نے بتلایا کہ غم نتیجہ ہے خوف کا اور مایوسی کا نتیجہ خوف ہے۔

حضور کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو وہ تین نعمتیں حاصل ہو جائے یعنی: حُرّیت، اُخوّیت، مساوات۔ یہ اصول سہ گانہ ہیں۔

قرآن حکیم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس زندہ کتاب نے دنیا کو پہلی مرتبہ حقیقی حُرّیت، مساوات اور اُخوّیت کی تعلیم دی۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ قوانین بھی نافذ فرمادیے کہ جن کی بدولت یہ اصول سہ گانہ زندہ رہ سکتے ہیں۔

قرآن حکیم نے اُن تمام مفاسد کا سد باب کر دیا جو انسان کو حُرّیت سے محروم کر سکتے ہیں۔ مثلا: شرک کی مختلف صورتیں انسان کو حُرّیت سے محروم کر سکتی ہیں، قرآن نے ان سب سورتوں کو باطل قرار دے دیا۔ ملوکیت اور اس کی مختلف صورتیں ہیں، چنانچہ سب جانتے ہیں کہ سلاطین، ابن آدم کو اپنا مطیع بنانا چاہتے ہیں اور کوئی شخص دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔

حُرّیت ختم ہوتی ہے: (۱) شرک سے، (۲) غلامی سے، (۳) بادشاہت سے۔ بادشاہت (ملوکیت) سے حریت کی نفی ہوتی ہے۔ ملوکیت غیر اللہ کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ اس لیے اسلام ملوکیت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یزید کی ملوکیت کو حسین رضی اللہ عنہ برداشت نہ کر سکے، کیونکہ یہ دین میں بدعت ہے۔

حُرّیت کی قسمیں:

(۱) حُرّیت نفس۔ (۲) حُرّیت ضمیر۔ (۳) حُرّیت عقل (۴) حُرّیت علم (۵) حُرّیت عمل۔ (۶) حُرّیت وطن۔ (۷) حُرّیت اظہار و خیال وغیرہ۔

نوٹ: تمام اعمال میں توکل کو وہی درجہ حاصل ہے جو انسانی جسم میں سر کو حاصل ہے۔

## کچھ وسیلے کے بارے میں:

وسیلہ عربی لفظ ہے ،جس کے معنی قرب کے ہیں۔لیکن اردو میں اس کے معنی ذریعہ کے لیے گئے ہیں۔

## وسیلے کی تعریف:

علم اور عبادت اور شریعت کے اعلی اخلاق کو اختیار کر کے سبیل اللہ کی محافظت کرنا،یعنی دینی احکام کی حفاظت کرنا۔

## وسیلہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

رسول خدا ﷺ کی دعا اور شفاعت کا وسیلہ آپ کی حیات طیبہ میں تھا۔قیامت کے دن دوبارہ اس کا موقع ہوگا۔جبکہ خلقت آپ کی شفاعت کا وسیلہ ڈھونڈے گی۔دوسرا وہ وسیلہ جس میں اللہ تعالیٰ کو انبیاء یا صالحین کی ذات کا واسطہ دلایا جاتا ہے۔یہ معاملہ نہ رسول خدا کی حیات طیبہ میں تھا اور نہ پردہ فرمانے کے بعد۔بہر حال اس قسم کا وسیلہ غیر مشروع ہے۔

## لَا مُخَوِّفَ إِلَّا اللّٰهُ (سوائے اللہ کے کوئی ڈرانے کے لائق نہیں)

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کائنات میں کسی کا اختیار،کسی کی چاہت، اور کسی کی مرضی نہیں چلتی،اور نہ اس کے سوا کوئی کائنات میں نافع اور ضار ہے۔اگر یہ یقین دل میں اتر جائے تو اب خوف غیر اللہ سے کرنے کی گنجائش نہیں رہتی ۔(بقرہ :۴۰، مائدہ:۴۴،عمران:۱۷۵)

## خوف کی قسمیں:

(۱) طبعی خوف۔ (۲) غیر طبعی خوف۔ (۳) غیر اللہ سے خوف

**طبعی خوف:** جیسے:انسان کو سانپ سے یا جنگلی درندے سے،یا سامنے

کھڑے دشمن سے، یا غلطی یا جرم ہو جانے سے سزا کا خوف ہوتا ہے وغیرہ۔ یہ سب طبعی خوف ہے۔ یہ اسلام میں مذموم نہیں ہے اور نہ تو ایسا خوف توحید کے تقاضوں کی ضد ہے۔ جیسے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبطی کے قتل کر دینے کے بعد سزا کا خوف ہوا تھا۔

**غیر طبعی خوف**: اس کی مثال جیسے: کسی بت سے، یا شیطان سے، یا صاحب قبر سے، اس طرح ڈر ہے کہ اگر اس کی فلاں قسم کی عبادت یا نذر و نیاز نہ کی گئی، تو فلاں قسم کی لت پڑے گی، یا نقصان ہوگا۔ جیسے: حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے اس قسم کے خوف کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طاغوت (بت- دیو وغیرہ) اور ان کے پجاری اللہ کے سوا غیروں سے مختلف طریقوں سے ڈرتے تھے، کہ اگر فلاں قبر پر چڑھاوا نہ چڑھائیں تو فلاں نقصان یا فلاں مصیبت یا فلاں تکلیف میں مبتلا ہوگا۔

**غیر اللہ سے خوف**: یہ لوگوں سے ڈرنا ہے۔ حکومت سے، حاکم سے، کثرت سے، طاقت سے، حالات سے، ماحول سے، عوام سے۔ (آل عمران: ۱۷۳)

﴿إِنِ الْحُكْمِ إِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ﴾ (انعام: ۵۷)

حکم اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہ سچی بات بیان فرماتا ہے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

﴿إِنِ الْحُكْمِ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ (یوسف: ۴۰)

سن رکھو کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے، اس نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت مت کرو۔

## قرآن مجید کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ

(۱) اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق ہے، رازق ہے، مالک ہے۔

(۲) اس لیے اس کے سوا کسی غیر کو کائنات پر حکمرانی یا بادشاہت کا حق حاصل نہیں ہے۔

(۳) پس ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے اور اس کے سوا کسی کی اطاعت، عبادت نہ کرے۔

(۴) بس یہی دین القیم یعنی ہمیشہ باقی اور قائم رہنے والا دین ہے۔

اب عقل و شعور والے خود انصاف کریں کہ کیا وہ دین جو مذکورہ بالا تین صداقتوں کی تعلیم دے، وہ دنیا سے مٹ سکتا ہے؟ اس لیے قرآن حکیم نے اس دین کو ''دین القیم'' سے تعبیر کیا ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

مسلمان اُسی صورت میں زندہ رہ سکتے ہیں جب وہ صرف ایک قانون کی اتباع کریں اور وہ قانون قرآن حکیم ہے۔ قرآن پر چلنا گویا اللہ کے حکم پر چلنا، اور اس کو عام کرنا گویا لوگوں کو قرآن پر چلنے کی ہدایت کرنا ہے۔ جس سے واضح ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی حکمران نہیں ہے۔ اگر کوئی اس کے برخلاف عقیدہ رکھتا ہے تو وہ شرک فی الحکم ہے۔

حکمراں ہے ایک وہی باقی بتان آزری

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف اسلام ہی سچا دین ہے، صحیح دستور حیات ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے پسندیدہ دین (دستور العمل) کو دنیا میں نافذ کر دیں۔ اور یہ اس وقت ہوگا جبکہ دیگر ادیان مٹ جائیں، اور یہ اسی وقت ہوگا جب کہ سارے مسلمان مل کر دین اسلام کی غلبے کے لیے جدو جہد کریں اور متحدہ جماعت کے اعتبار سے یعنی ہیئت اجتماعی کے اعتبار سے اُسی وقت

کوشش ہوسکتی ہے جب سارے مسلمان متفقہ طور پر قرآن کو مضبوطی سے تھام لیں۔یعنی قرآن حکیم پر جمع ہو جائیں اور امت محمدیہ کا نصب العین توحید الٰہی کی حفاظت اور اعلائے کلمۃ اللہ اشاعت دین کے عنوان سے کریں تاکہ اقامت دین اس دنیا میں ممکن ہو۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین اور دنیا دونوں کی بیک وقت بھلائی چاہتا ہے۔روحانی ترقی اور تزکیہ نفس کے لیے توحید سے بڑھ کر کوئی وسیلہ تصور میں نہیں آتا۔اگر کوئی شخص خدا کو مان لے اور خیر وشر میں اس کے سوا کسی اور کو قادر نہ سمجھے اور حشر وحساب کو مان لے تو پھر اس دنیا میں گناہ کا سرزد ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔اسلام کی تعلیم وحدت خالق ہے۔یعنی سب کا خدا ایک ہی ہے،اور وحدت مخلوق ہے۔یعنی سب اولاد آدم ہیں اور وحدت دین ہے۔یعنی تمام پیغمبروں کا دین ایک ہی ہے۔

## **محمد رسول اللہ کا مقصد انسانوں کو انسان سے جوڑنا ہے۔**

جس طرح آنکھ جو دیکھ نہ سکے کسی کام کی نہیں،پیر جو چل نہ سکیں کسی کام کے نہیں، ہاتھ جو پکڑ نہ سکیں کسی کام کے نہیں،اسی طرح وہ نماز جس سے آدمی برائیوں سے نہ بچ سکے کسی کام کے نہیں،وہ روزہ جس سے تزکیۂ نفس نہ ہو سکے اور جس سے رزق کی قدر معلوم نہ ہو سکے کسی کام کا نہیں،وہ زکوۃ جس سے جذبۂ سخاوت پیدا نہ ہو،جذبۂ مساوات اور جذبۂ انسانیت پیدا نہ ہو کسی کام کا نہیں،اسی طرح وہ حج جس سے زہد اور تقوی پیدا نہ ہو کسی کام کا نہیں۔

جس طرح تالاب سوکھ جائے تو تالاب نہیں کہلاتا،پھول سے اگر خوشبو ختم ہو جائے اور مرجھائے تو پھول نہیں کہلاتا،جس طرح گھر ویران ہو جائے تو گھر نہیں کہلاتا،اسی طرح جس دل میں ایمان نہ ہو وہ انسان نہیں کہلاتا۔زہد کے الفاظ میں زہد نہیں ہے اور نماز کے الفاظ میں نماز نہیں ہے۔

گذارندہ

الحاج قاری محمد ارشاد علی

مولوی، عالم جامعہ نظامیہ

بی۔ کام، عثمانیہ. ڈی-ایف-ای، ناگپور کالج۔

مؤلف کتاب اصلاحی تحفہ ''خادم تدریس القرآن''

ریٹائرڈ فائر آفیسر، بی ایچ ای ایل

حیدرآباد

باہتمام

صاحبزادہ الحاج محمد طاہر علی